اسلام اور مغربی دنیا

اصغر علی انجینئر

ایک ایسا وقت گزرا ہے جب یورپ اور شمالی امریکہ میں ایک ہی مذہب اور ایک ہی کلچر تھا، اگرچہ یورپ بہت سی لسانی اکائیوں پر مشتمل تھا۔ آج یورپ اور شمالی امریکہ دونوں میں کئی مذاہب پر عمل کیا جاتا ہے اور ان ممالک نے کثیر الثقافتی نظریہ اختیار کرلیا ہے کیونکہ ان ممالک میں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے لوگوں میں اضافہ ہورہا ہے اور مختلف مذاہب کے پیروکار وہاں خاصی بڑی تعداد میں اقلیتوں کے طور پر رہتے ہیں۔

دیگر مذاہب کے آبادکاروں کی طرح مسلمان بھی یورپ اور شمالی امریکہ دونوں میں سب سے بڑی اقلیت کے طور پر قیام پذیر ہیں۔ یورپی تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سیاسی کشمکش رہی ہے۔ صلیبی جنگیں یورپی تاریخ کا حصہ ہیں اور ان جنگوں کی وجہ سے اب تک یورپی نفسیات پر مسلمانوں کے بارے میں یہ غلط تاثر غالب ہے کہ ''مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن تھا''۔ امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان موجودہ کشمکش کی صورت میں یہ آویزش آج بھی جاری وساری ہے۔

موجودہ دور میں یہ کشمکش بڑھ گئی ہے اور ۹/ستمبر کے حملہ نے اس کشمکش میں زیادہ شدت پیدا کردی ہے۔ مسلمانوں کی اپنی صفوں میں موجود شدت پسند لوگ، مشرق وسطیٰ میں مغرب کی شدت پسندی کا جواب شدت پسندی سے دے رہے ہیں اور اس کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اس خطے کے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مغرب میں شدید تعصب پایا جاتا ہے۔ مسلمان شدت پسند مغربی ممالک میں تشدد پھیلانے کے لیے (بلاشبہ غلط طور پر) جہاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور اس سے یہ غلط تاثر مضبوط ہورہا ہے کہ اسلام تشدد اور جنگ کا مذہب ہے اور دوسرے مذاہب خاص طور پر عیسائیت کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر رہنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ تاثر اگرچہ غلط ہے مگر پوری غیر مسلم دنیا میں عام ہے۔ تاریخ میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے اسے اسلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسے بیانات اور واقعات مشاہداتی طور پر بیان کردہ ہوتے ہیں، یہ کسی مذہب کی حقیقی صورتحال پر مبنی نہیں ہوتے اور مذہبی تعلیمات کا موازنہ کسی دوسرے مذہب کی مذہبی تعلیمات سے اور تاریخ کا کسی دوسرے مذہب کی تاریخ سے موازنہ ہونا چاہئے نہ کہ تاریخ کا موازنہ تعلیمات سے کیا جائے۔ اسلام نے ہمیشہ یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ متوازی سطح پر بقائے باہمی کے اصول کے تحت بطور مذہب اپنے آپ کو برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگیں (اسلام اور عیسائیت کے درمیان نہیں) ہوتی رہیں۔ یہ جنگیں اور لڑائیاں حکمران طبقوں کے درمیان ہوتی تھیں نہ کہ مسلمان اور عیسائی عوام میں۔ (آج بھی) مغربی اخبارات مفادات کے ٹکراؤ کو مذاہب کے ٹکراؤ کے طور پر پیش کررہے ہیں، ساتھ ساتھ مسلمان بنیاد پرست ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں جس سے ایسا تاثر مل رہا ہے کہ جیسے کوئی مذہبی ٹکراؤ فی الواقعہ موجود ہے۔

آج تہذیبوں کے درمیان کوئی تصادم موجود نہیں ہے۔ اگرچہ پروفیسر ہنٹنگٹن کی خواہش ہوگی کہ ہم اس کی بات کو سچ مان لیں۔ ہنٹنگٹن کے مقالے کا بنیادی موضوع عیسائی اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان ہونے والی جنگیں ہیں۔ اس نے مذہبی تعلیمات کے مبینہ ٹکراؤ کو اپنے مقالے کا موضوع نہیں بنایا۔ قرون وسطیٰ میں بھی مذاہب کے درمیان کسی قسم کا تصادم موجود نہ تھا بلکہ جو لڑائیاں بھی ہوئیں وہ عیسائی اور مسلمان سلطنتوں کے درمیان لڑی گئی تھیں۔ جب مسلمان ایک غالب قوت تھے اس وقت یہودی اور عیسائی حکومت میں اہم مناصب پر فائز تھے۔ مسلمان ممالک میں یہودی اور عیسائی رعایا ہمیشہ امن وسلامتی کے ساتھ رہے جبکہ انہیں یورپ میں تنگ کیا جاتا رہا اور انہیں پسماندہ علاقوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اسلامی ممالک میں انہیں کبھی ایسے جبر اور پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔

احمد ایم ایچ شبول اپنے مقالے ''بازنطینی مذہب اور ثقافت کے بارے میں اسلامی عربوں کا تصور'' میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا وہ زمانہ جب عرب غلبہ میں تھے مذہبی، سیاسی اور فوجی صورت حال کے منظر نامہ کو سامنے رکھتے ہوئے، عرب بازنطینی کشمکش کی حقیقی تاریخ کے مطالعہ کے بعد، کیا کوئی شخص عرب فتوحات اور بعد کے ادوار میں اس کشمکش کو بغیر کسی دقت کے اور اصولی طور پر مذہبی کشمکش قرار دے سکتا ہے؟ میرے خیال میں ایسا کوئی تصور غلط اور گمراہ کن ہوگا'' اس کے بعد آپ نارمن ڈینیل کے

خیالات بیان کرتے ہیں کہ ''ایسے کسی تصادم کے تصور کو تاریخی حقیقتوں میں جا کر دیکھنے اور سچ کی تلاش کیے بغیر اسے مذہبی جنگ قرار دینا ایک غلط بات ہوگی''۔

فتوحات کے حوالے سے عرب بازنطینی جنگوں میں موجود پیچیدہ معاملات کے ضمن میں جناب احمد مزید لکھتے ہیں کہ ''مذکورہ تصادم اور کشمکش کے بارے میں عرب بازنطینی معاملات کا ذکر جن کتب اور ذرائع میں موجود ہے، ان ذرائع میں اس تصادم کے معاشی، سیاسی اور قبائلی عوامل کا بھی ذکر ہے جن کی وجہ سے ماضی میں یہ تصادم واقع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عرب اسلامی ادب، کشمکش کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ کے طور پر پیش کرنے کی بجائے اس کی عربوں اور بازنطینیوں کے درمیان تصادم کے طور پر تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق شامی ذرائع اور کتب سے بھی ہوتی ہے۔ شام کے عیسائی عرب جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد نے بازنطینیوں کے خلاف مسلمان افواج کا ساتھ دیا تھا، جبکہ کئی دوسرے عیسائیوں اور سامریوں نے (جو فلسطین کے رہنے والے تھے) پیش قدمی کرنے والے مسلمان عربوں کے ساتھ کئی طریقوں سے تعاون کیا۔ لہٰذا قرون وسطیٰ میں جو بھی جنگیں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئیں ان کی ماہیت مذہبی نہیں تھی بلکہ یہ جنگیں مختلف سیاسی اور نسلی وجوہات اور عوامل کی بنیاد پر لڑی گئی تھیں اور ان میں عرب عیسائیوں نے مسلمان عربوں کا ساتھ دیا تھا۔

> مذہبی تعلیمات کا موازنہ کسی دوسرے مذہب کی مذہبی تعلیمات سے اور تاریخ کا کسی دوسرے مذہب کی تاریخ سے موازنہ ہونا چاہئے نہ کہ تاریخ کا موازنہ تعلیمات سے کیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی ان جنگوں کے بارے میں قائم غلط تصور کو ختم کیا جائے۔ اس غلط تصور کے خاتمہ سے موجودہ کشمکش کی ماہیت پر بھی دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اسلام دیگر مذاہب بطور خاص عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ بامقصد اور متحمل تعلقات کا حامی رہا ہے۔

آج یورپ اور شمالی امریکہ میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان بطور اقلیت اور بہت سے ملکوں میں جمہوری نظاموں کے تحت رہتے ہیں۔ لہٰذا قرون وسطیٰ اور موجودہ دور کی حقیقی صورت حال کے درمیان ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان سلطنت دنیا کے وسیع وعریض خطوں تک پھیلی ہوئی تھی اور مسلمانوں کی کثیر تعداد اسلامی نظام حکومت کے تحت رہ رہی تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی کچھ تعداد ایسے علاقوں میں بھی آباد تھی جہاں وہ اقلیت میں تھے۔ لہٰذا فقہاء نے اس دور میں جو ادب تخلیق کیا وہ مخصوص سیاق وسباق کا حامل تھا۔ (اس دور میں) اول یہ کہ مسلمان اکثریت میں تھے۔ ثانیاً حکمران مسلمان تھے اور مسلمان حکومتیں بادشاہی نظام کے تحت چلائی جارہی تھیں یعنی وہاں جمہوری نظام رائج نہ تھا۔ لہٰذا موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حوالے سے تمام فقہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ ایسی نئی فقہ مرتب کی جائے جو نئے حالات اور نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرے۔ آج دارالحرب اور دارالاسلام کے تصورات مکمل طور پر فرسودہ ہو چکے ہیں۔

آج ہمیں ایک طرف جمہوری طرز حکومت اور دوسری طرف انسانی حقوق اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق جیسے معاملات کو سامنے رکھ کر نئی فقہ کی تشکیل کرنا ہوگی۔ ہمارے فقہاء کو مشینی انداز سے قرون وسطیٰ کے فقہاء کی رائے کو ہی نہیں دوہرانا چاہئے، جنہوں نے بہت ہی مختلف نوعیت کے سیاق وسباق کے اندر رہ کر کام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے مخصوص تجربات وحالات کو سامنے رکھ کر مختلف قسم کے مسائل کا حل تلاش کیا تھا۔ ہمیں اپنے حالات اور سیاق وسباق کے حوالے سے اپنے مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرنا ہے۔ اہل کتاب کے لیے قرآن پاک کا اہل الذمہ کا تصور بہت تخلیقی اور ذمہ دارانہ تھا۔ حفاظت کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے قرآن پاک نے غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تاہم اب ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ اہل الذمہ کا تصور آج کے بدلے ہوئے حالات میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا پیش کردہ ذمی کا تصور اس وقت کے حالات سے مخصوص تھا نہ کہ یہ ابدی طور پر لاگو کیے جانے والے اصول کے طور پر تھا۔ آج تمام اقلیتوں کو اقوام متحدہ کے منشور اور بین الاقوامی قانون کے تحت یکساں سیاسی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ مرتب کرتے وقت اقوام متحدہ کے اس منشور کو ضرور سامنے رکھا جانا چاہئے۔ غیر مسلم اقلیتیں بھی ان حقوق کی اتنی ہی حقدار ہیں جتنی کہ مسلمان اقلیتیں غیر مسلم ممالک مثلاً یورپ، شمالی امریکہ، ہندوستان اور کئی دوسرے ممالک میں مستحق ہیں۔

اگر کوئی مذہبی اقلیتی حکومت قائم ہو تو وہ بھی مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دے گی۔ قرآن پاک کے پیش کردہ اہل الذمہ کے تصور میں بھی مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی، صرف سیاسی حقوق کی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔ موجودہ تبدیل شدہ حالات میں سیاسی حقوق کی بھی ضمانت دینا ہوگی۔ ایک خاص حد کے بعد اقلیتوں کو نہ صرف مکمل شہری حقوق دیے جانے چاہئیں بلکہ ثقافتی اور مذہبی حقوق بھی۔ لہٰذا نئی فقہ ترتیب دیتے ہوئے ان سب باتوں کو مدنظر رکھا جانا چاہئے اور مسلمان ممالک کو بھی یہی حقوق اپنے مسیحی، یہودی یا دیگر غیر مسلم شہریوں کو دینے کا اہتمام کرنا ہوگا۔

ایک خاص مرحلے کے بعد غیر مسلموں کے ساتھ عام شہریوں جیسا سلوک کیا جانا چاہئے اور انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی حقوق بھی دیئے جانے چاہئیں۔ بدقسمتی سے مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو مکمل شہری حقوق حاصل نہیں اگرچہ انہیں وہاں اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ

اب بھی دوسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ چند مسلم ممالک میں تو انہیں اپنے مذہبی مقامات کا انتظام سنبھالنے یا عبادت کے مقامات قائم کرنے کی آزادی نہیں ہے۔

اس کے برعکس قرآن کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام مذہبی مقامات کی یکساں حفاظت کی ضمانت فراہم کی جائے اور ان کی تعداد بڑھانے کی بھی اجازت دی جانی چاہئے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے گرائی جا چکی ہوتیں۔ اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے'' (۲۲:۴۰)

قرآن پاک میں نہ صرف مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے بلکہ تمام دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت اور یہودیت کو بھی قرآن پاک یہ ضمانت فراہم کرتا ہے۔ [اس ضمانت کے تحت] مسجدوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کی جانی چاہئے۔ اقلیتوں کے حقوق کی دونوں صورتوں میں ضمانت دی جانی چاہئے کہ جب مسلمان خود اقلیت میں ہوں اور اس وقت بھی جب غیر مسلم اقلیت میں ہوں۔ قرآن پاک کے احکام کی اس نہایت واضح اور نمایاں روح کو قرون وسطیٰ کے فقہی ادب میں سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اس وقت مسلمانوں کو اقتدار اور طاقت حاصل تھی۔

غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ پر غور وخوض کرتے ہوئے قرآن کی اس روح، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کو دوبارہ جگہ دی جانی چاہئے۔ اس عالمگیر اور سمٹے ہوئے فاصلوں والی دنیا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بطور اقلیت دنیا کے دیگر ممالک میں رہائش پذیر ہے اور مغرب کے اکثر ممالک میں انہیں یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔ اگرچہ عملی طور پر مسلمانوں کو کافی مسائل کا سامنا ہے مگر آج اسلام سیکولر جمہوری ممالک میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ سیکولر ڈیموکریسی ان قوانین اور اعتقاد کے نظاموں پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے جو اس کے تابع پروان چڑھیں۔ مغربی ممالک میں سیکولر ڈیموکریسی اسلام پر بھی اثر مرتب کر رہی ہے۔ کمیونزم کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ کمیونزم نے سوویت یونین میں استبداد پر مبنی نظام کی ترویج کی تھی۔ لوگوں کو بنیادی آزادی حاصل نہ تھی مگر یورپ میں کمیونزم پر جمہوری مغرب نے گہرا اثر ڈالا اور چند کمیونسٹوں نے ''یوروکمیونزم'' کا تصور اجاگر کیا جو دوسرے نظاموں کے لیے فطری طور پر زیادہ متحمل، مؤدب اور جمہوری تھا۔

اسی طرز پر یوروا سلام کا تصور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے جو کثرت اور کثیر الثقافتی رجحانات کے حق میں ہو اور دوسرے ادیان کے لیے بردبار رویے کا حامل ہو اور ان کے لیے اپنے اندر تکریم واحترام رکھتا ہو۔ یوروا سلام کا یہ تصور مغربی طرز زندگی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کے لیے ہوگا مگر اس کا قبول کرنا اسلام کے لیے ضروری ہے۔ شریعت کے قوانین کو نافذ کرنے کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ اکثر مسلمان شریعت کے قوانین کو اسی صورت میں نافذ کرنے پر زور دیتے ہیں جس صورت میں انہیں یہ ورثے میں ملے۔ اس سے پیچیدہ مسائل جنم لیتے ہیں۔

اسی طرح حجاب کے تنازعہ نے بھی بہت سے یورپی ممالک بشمول فرانس اور انگلستان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے تعلیمی اداروں میں حجاب پہننے پر پابندی عائد کر دی ہے، یہ پابندی بذات خود کثیر الثقافت ہونے کے تصور کے خلاف ہے۔ مگر مسلمانوں کو بھی اپنی چند رسومات پر از سر نو غور کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر انگلستان میں ایک اسکول کی خاتون استاد نے کلاس کے اندر بھی اپنا نقاب (جس میں سے دو آنکھیں ہی ظاہر تھیں) اتارنے سے انکار کر دیا اور زور دیا کہ یہ اس کا مذہبی عقیدہ ہے۔ یہ رویہ کسی طور بھی درست نہیں۔ قرآن پاک میں کہیں بھی یہ مطالبہ نہیں کہ عورتیں اپنا چہرہ ڈھانپیں۔ قرآن پاک میں صرف نظر نیچی رکھنے اور باوقار لباس پہننے کی تاکید ہے (ملاحظہ کیجئے ۲۴:۳۱)۔ کسی بھی فقیہ نے چہرہ ڈھانپنے پر زور نہیں دیا۔ سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جاگیردارانہ

امریکا میں قرآنی پوسٹرز کی نمائش

معاشرے میں فروغ دی گئی ثقافتی رسم ہے اور طبقہ خواتین پر جبراً مسلط کی گئی ہے۔ غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فقہ مرتب کرتے وقت ایسی ثقافتی رسومات پر نظر ثانی کرنا ہوگی جن پر مذہب کی آڑ میں عمل کیا جاتا ہے۔ ان مسائل پر از سر نو غور درکار ہے۔ آج کوئی بھی یہ مشورہ نہیں دے رہا کہ مسلمان خواتین مغربی طرز کا لباس پہنیں (جسے مردوں نے بڑی عجلت سے بغیر شرعی مسائل کی پرواہ کیے پہن لیا ہے)۔ تاہم وہ باوقار لباس پہنیں جس سے جنسی کشش پیدا نہ ہو۔

روایت پسند مسلمان قرآن پاک کے احکام پر عمل کرنے کی بجائے مختلف فقہاء کی آراء پر عمل پیرا ہیں۔ نقاب کرنا ہرگز قرآن پاک کے احکام کے مطابق نہیں، نہ ہی اس کا تعلق جنسی رویے کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے ہے۔ یہ بعض عرب ممالک مثلاً سعودی عرب میں تہذیب وتمدن کا حصہ ہے جس کی دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمان باقاعدہ لگے بندھے انداز سے نقل کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ سعودی عرب ایک ماڈل اسلامی ریاست ہے۔ ایسا رویہ مغرب کے اصل باشندوں اور وہاں ہجرت کے ذریعے پہنچے ہوئے لوگوں کے درمیان مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ یورپ، شمالی امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے کثیر الثقافتی اور مذہبی کثرت کو قبول کر لیا

ہے۔مگر جب ایک مذہب کو ماننے والا گروہ کسی سمجھوتے یا کچھ لو اور کچھ دو کی روح پر عمل پیرا نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں دو مذاہب کے درمیان تناؤ لازمی طور پر ابھرے گا۔لہٰذا کسی کو بھی بنیادی اصول وضوابط کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہئے بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کے نظریہ پر عمل کرنا چاہئے۔

قرون وسطیٰ کے دوران مرتب کی گئی فقہ میں یقینی طور پر جاگیردارانہ ثقافت کی جھلک ملتی ہے جو جدید جمہوری کلچر کے مطابق نہیں، جس کی بنیاد انسانی حقوق اور حقوق نسواں پر ہے۔نئی فقہ اگر صرف مسلمہ قرآنی احکام کو بنیاد بنا کر آگے بڑھائی جائے تو یہ جدید اقدار کو اپنے اندر سمونے میں مدد ومعاون ثابت ہوگی اور مسلمان عورتوں کو

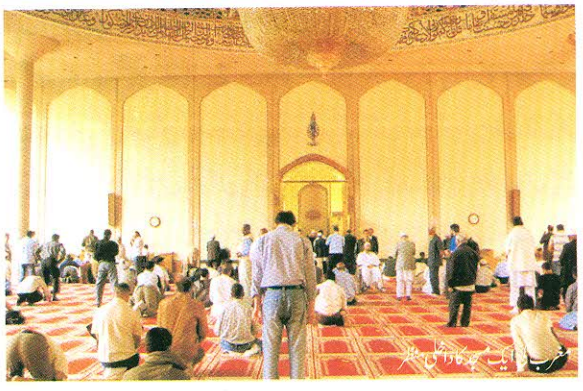

انتخاب وعمل کی آزادی حاصل ہوگی۔مغربی معاشرے میں بنیادی آزادی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور قرون وسطیٰ کا کلچر چونکہ جاگیردارانہ ہے۔لہٰذا زندگی میں بنیادی آزادی کے پہلوؤں کو محدود کر دیتا ہے اور استبدادانہ کلچر کو خدائی قرار دے کر نافذ کرنے پر منتج ہوتا ہے۔

تاہم، یوروا سلام کے فلسفے کو مغربی معاشرے میں رائج بنیادی آزادیوں کے فلسفے کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہوگا اور ایک نئی فقہ کی ترویج کرنا ہوگی جو جمہوری کلچر سے ہم آہنگ ہو۔قرآن مسلمانوں سے دوسرے مذاہب کی تکریم کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ مسلمان دوسروں کی تہذیب اور تمدن کا احترام کریں جب تک غیر مسلم بنیادی اسلامی اخلاقیات کی بے حرمتی نہ کریں۔آج مسلمان دانشوروں کو غیر مسلم معاشروں کے لیے نئی فقہ کی تیاری کے لیے تخلیقی کردار ادا کرنا ہوگا۔مسلم ممالک میں روایت پسند علماء بہت اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔لہٰذا کوئی تبدیلی لانا نہایت مشکل کام ہے۔اس کے برعکس یورپی ممالک میں حالات مختلف ہیں۔بلا شبہ روایت پسند علماء ان ممالک میں بھیجے جارہے ہیں اور وہ مسجدوں میں روایتی فہم دین پر مبنی خطبے دیتے ہیں اور بہت سے مسلمان ان خطبوں سے تاثر بھی قبول کر لیتے ہیں اور روایتی شریعت پر عمل کرنے کے خواہشمند ہیں۔

روایت پسند اسلام انہیں ایک اور وجہ سے بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔یہ بیگانگی کا احساس ہے۔بیگانگی کا یہ احساس انہیں روایتی آبائی ثقافت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔نسلی حملے بھی اس احساس کو مزید شدید کر دیتے ہیں اور ان دونوں تہذیبوں کے درمیان سمجھوتا پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔موجودہ دور کی سیاسی صورت حال بھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے معاندانہ بن چکی ہے۔چند مسلمان نوجوان القاعدہ کے نیٹ ورک کی طرف کئی پیچیدہ وجوہات کی بناء پر مائل ہو رہے ہیں۔مثلاً اسلامی دنیا، خاص طور پر مشرق وسطیٰ سے روا رکھی جانے والی سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے کئی نوجوان القاعدہ کے نیٹ ورک کا حصہ بن رہے ہیں۔آج اسلام کو تشدد پسندی اور انتہا پسندی کا ہم معنی خیال کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک عقل کے استعمال پر بہت زور دیتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی'' (۲:۲۶۹)۔مسلمان جس صورت حال میں گھرے ہوئے ہیں اس سے نپٹنے کے لیے عقل کا استعمال کیوں نہیں کرتے۔تشدد آمیز جوابی اقدامات بہت بڑی تعداد میں معصوم جانوں کے زیاں کا باعث بن رہے ہیں اور دشمنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔آپ مغربی طاقتوں کی طرف سے شدت پسندی کا جواب کہیں نہ کہیں بم پھینک کر دے سکتے ہیں مگر اس سے کوئی بھلائی نہیں ہوگی۔اس کی بجائے عقل کا استعمال کر کے مغربی ممالک میں لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکتی ہیں اور مغربی حکمرانوں کو پوری دنیا میں رائے عامہ کی نظر میں تنہا کیا جاسکتا ہے۔عقلمندی یہ ہے کہ پرامن انداز سے میڈیا کی ہمدردی حاصل کی جائے۔اور تشدد پسندی ذرا بھی برداشت نہ کی جائے۔قرون وسطیٰ کی فقہ میں جہاد کی بہت تاکید کی گئی ہے۔قرون وسطیٰ میں ہی جہاد کی صورت تبدیل ہوگئی تھی۔اسی دور میں ہر چیز کا فیصلہ تلوار سے کیا جاتا تھا اور لوگوں کے حقوق کا تصور موجود ہی نہ تھا، ہمیں اس طرح کے فہم دین کو رد کر دینا چاہئے اور نئی فقہ میں امن اور انسانی حقوق پر زور دیا جانا چاہئے۔امن وسلامتی کو اسلام میں مرکزی مقام حاصل ہے۔سلام (امن) اسلام کا جزو لاینفک ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وصفی نام بھی ہے۔

لہٰذا نئی فقہ میں سلام، رحمت، حکمت اور عدل جیسی اقدار کو مرکزی مقام دیا جانا چاہئے۔نئی فقہ کے لازمی جزو کے طور پر ان اقدار کی تعلیم تمام مدارس میں دی جانی چاہئے۔یہ سب سے بنیادی اقدار ہیں جن کی تعلیم قرآن پاک میں دی گئی ہے۔ایسا کرنے سے اسلام کا تاثر مکمل طور پر بدل جائے گا۔اس طرح پیدا شدہ تاثر زیادہ کریم النفس ہوگا اور بدترین دشمن بھی اسلام کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گے۔نئی قیادت کو چاہئے کہ وہ ان روایت پسند علماء کو بطور خاص پیش نظر رکھے جو نئی سوچ اپنانے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو یہ بات بہت ناقابل عمل معلوم ہوگی، مگر اسلام میں یہ تبدیلی ہمارے پیچیدہ مسائل کا قابل عزت حل ثابت ہوگی اور یہ جنگ سے تباہ حال دنیا میں امن اور بقائے باہمی کو یقینی بنائے گی جبکہ اس وقت دنیا کا امن طاقتور امریکی مفادات کی زد میں ہے۔ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ تشدد کے ذریعے جواب دے کر ہم امریکہ کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

اصغر علی انجینئر انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، ممبئی، انڈیا کے صدر نشین ہیں۔
ترجمہ: محمد اشرف طارق، ٹرانسلیشن آفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل